خلیفہ عبدالحکیم

تجدید و احیاء

یہ نظریہ تمام تصوری فلسفہ کے مسلمات اور خدا پرستی کے جملہ معتقدات کی اساس ہے کہ زندگی کے بنیادی اقدار ابدی اور کائناتی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ عالم تغیر و انقلاب کے محکم حقائق ہیں۔ یہ محبت و صداقت اور حسن و خوبی کے اقدار جزوی طور پر افراد، اشیاء اور ہیئات اجتماعی میں جلوہ فرما ہیں۔ بقول مینی سن: "بارالٰہا! وہ تیرے ہی پراگندہ انوار ہیں، اور تیری تجلیات ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں"۔ جملہ زندگیاں ایک یا زیادہ اقدار کی صورت پذیری سے ترقی پاتی ہیں۔ اور ان کی خلاف ورزی سے جامد و بے حس یا فنا در آغوش ہو جاتی ہیں۔ ادنیٰ درجہ پر صداقت کی قدر مادی کائنات میں بھی جلوہ فرما ہے جس کی نوامیں فطرت کے ساتھ موافقت صداقت کی غیر تغیر پذیری کی آئینہ دار ہے۔ اسی وجہ سے افلاطون نے عالم مثال کی ہمیشگی اور غیر تبدل پذیری کی تعلیم و تفہیم میں ریاضی کو ایک تمہیدی حیثیت عطا کی ہے۔ وائٹ ہیڈ کے قول کے مطابق "وہ عالم جو استمرار پر زور دیتا ہے، عالم اقدار ہے۔ قدر اپنی ماہیت میں لازمانی اور لامکانی ہے۔ اس کی اصلیت کسی عارضی حالت سے پیوست نہیں ہے۔ کسی فنا پذیر حالت کا اتصال صرف اس لئے گرانقدر ہے کہ وہ کسی لافانیت سے اشتراک رکھتا ہے"۔ خدا کا اسلامی تصور عالم اقدار کے دائمی ثبات اور غیر تغیر پذیری کا تصور ہے۔ فطرت اللہ قدر کی غیر تغیر پذیر خاصیت کا نام ہے۔ اس امر کا ذہنی شہود حکمت ہے، جسے قرآن حکیم خیر کثیر سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ حکمت عمل میں جلوہ فرما ہو کر حیات طیبہ کی تشکیل کرتی ہے۔ انسان اپنی عظیم امکانی قوت اور خلقی صلاحیت کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اخلاق الٰہی سے تخلق پیدا کر کے، جس کے مطابق اس کی فطرت کی تخلیق ہوئی ہے، دیگر مخلوقات سے بلند ہوتا رہتا ہے۔ قرآن کی رو سے مذہب حق کی اولین صفت اسی ابدی حقیقت کی یافت و شہود ہے۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ط لا تبدیل لخلق اللہ ط ذالک الدین القیم ق (الروم - ۳۰)

اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بناوٹ پر کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی سچا اور ٹھیک دین ہے۔

اس دین حق کو قرآن اسلام سے تعبیر کرتا ہے۔ جس کے معنی خدا کے آگے سر نیاز جھکا کر داخلی و خارجی امن و سلامتی حاصل کرنے کے ہیں۔ بالفاظ دیگر زندگی کو ابدی اقدار کے ساتھ ہم آہنگی میں تدریجاً ڈھالا جاتا ہے۔ قرآن کائنات کے دو دائروں "عالم امر" اور "عالم خلق" کو پیش کرتا ہے۔ "عالم امر" ابدی اقدار کے لئے "ام الکتاب" کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیوی تغیر و تبدل کے احکام، جو کسی قدر کے حامل ہوتے ہیں، ان کا اجراء اسی "لوح محفوظ" سے ہوتا ہے

واقعات و حالات، عالم تغیر میں تخلیقی و ارتقائی مقاصد کے تحت بدلے جاتے ہیں، لیکن اقدار جن کی وصولیابی پیش نظر ہوتی ہے، وہ اپنی اصلی و ابدی ماہیت نہیں بدلتے۔

ما ننسخ من ایۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا ط (البقرہ)
ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں، یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں

قرآن ایک طرف قوانین فطرت اور ابدی اقدار کے اٹل ہونے کو اور دوسری طرف دائمی ارتقائی تبدیلی کو، بحیثیت فطرت الٰہی کے پیش کرتا ہے۔ اور اس کی تعریف بطور دین حق کے کی گئی ہے جو کل کائنات، بنی نوع انسان اور اس کے تحت و فوق مخلوقات کا مذہب ہے۔

عارضی واقعات کی فنا پزیر دنیا میں عالم ثبات و دوام کو مادی شکل میں بتدریج محسوس کیا جانے لگا ہے۔ تجربہ قدر واقعات کی عارضی دنیا میں خود اپنی حقیقی لافانیت کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ سائنس کا قانون فطرت اور انسانی انا کی شخصی انفرادیت اس طریق عمل کے نمایاں خد و خال ہیں۔

قرآن جملہ خدا پرست مذاہب کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انبیائے سابقین سے لیکر آنحضرتؐ تک اصول دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ابراہیمؑ، موسٰیؑ، عیسٰیؑ، اور محمد صلعم۔ اور وہ تمام نامعلوم اور فراموش شدہ پیغمبر جنہوں نے خالق کائنات کی وحدانیت کا اعلان کیا، سب ایک ہی برادری کے افراد تھے۔ رسوم و عادات، طریقہ ہائے عبادت، رواج، معاشری و معاشی سانچے، سب حالات کے تحت تبدیل ہوتے رہے اور دین کی اصل حقیقت ان مختلف صورتوں میں اپنا ظہور کرتی رہی۔ انسانیت حقیقی اقدار کی دید و شہود سے محروم ہو کر بارہا خود اپنے آفریدہ وہم و گمان کو یا کسی مخلوق کو الوہیت کا درجہ دے کر ان کی پرستش میں مبتلا ہوتی رہی۔ مذہبی عقائد، رسوم اور رواج نے ہر دین میں مرکزی حیثیت اختیار کر لی اور بجائے روح و معنی کے لفظ و صورت کی پرستش کی جانے لگی۔ غیر ضروری اختلافات پر شدت نے انسانیت کو متحارب مذہبی فرقوں میں منقسم کر دیا۔ سچے مذہب کی آفاقیت اور وسیع المشربی، قبائلی، فرقہ وارانہ اور مقامی ہو کر رہ گئی۔ متقدات استخوان بے مغز ہو کر رہ گئے۔ نفرت نے محبت کی جگہ لے لی۔ اور ریا ہی حق و انصاف کے اصول کو بھلا دیا گیا۔ چند حکمران طبقے دین و مذہب کو اپنی جاگیر بنا بیٹھے۔ انبیاء کے قصص جس طرح قرآن میں بیان ہوئے ہیں، ان میں اصلاح عقائد و رسوم کی تمام کوششوں کے خلاف مستقل مفادات رکھنے والی جماعت کی مخالفت و سرتابی کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ ہندو مت ذات پات کے سخت گیر نظام کی صورت میں روبہ تنزل ہو گیا اور رسم و رواج کی پابندی مقصد وجود کی بابت کسی قسم کے ایمان سے زیادہ اہم بن گئی۔ ویدانتی، برہمنیت اور بدھ مت نے اپنی فلسفیانہ پرداز میں عالم جاوید کو عالم تغیر سے جدا کر کے موخر الذکر کو بے حقیقت قرار دیا۔ عیسائیت بھی اپنے راہبانہ مسلک کے سبب آخرت پرست ہو کر متمدن اور مہذب دنیا سے کنارہ کش ہو گئی۔ پرستاران مسیح

نے ان رشتوں کو قطع کر دیا جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا۔ انھوں نے ایک عظیم انسان کو الوہیت کا درجہ دے کر گناہ آدم اور فطری معصیت کے ذریعہ دیگر تمام انسانوں کی تذلیل کی۔ اس داغ مذلت کو کوئی پاکباز زندگی بھی دور نہیں کر سکتی تھی جبتک کہ وہ حلول، کفارہ اور نیابتی عقوبت پر بے چون وچرا ایمان نہ لے آئے۔

اسلام نے عالم قدر کو عالم تغیر کے ساتھ جوڑ کر تمام سچے ادیان کی حقیقی مماثلت کا اعلان کیا اور آزادانہ ہستیوں میں منقطع کردہ دینوی واخروی کو وجود حقیقی کے رخوں کے طور پر ایک دوسرے سے متمائز کیا۔ اسلام نے جو انقلاب پیدا کیا وہ اسی کلی نقطۂ نگاہ کا رہین منت ہے۔ اسی تعلیم کے سبب امت مسلمہ ایک محرک قوت بن گئی۔ حیات نے ایک تحقیقی سفر کی صورت اختیار کر لی۔ کیونکہ قرآن نے یہ تعلیم دی تھی کہ حق کی تلاش روحانی اور غیر روحانی طریقوں سے کی جائے۔ انسانیت کے تمام معاصر اور متقدم علوم کی سرگرمانہ تلاش وتدوین کی گئی، اور نئے نظریات پر جدید بالائی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ انسان کی روح کو آزادی بخشی گئی اور خالق ومخلوق کے درمیان کوئی وسیلہ حائل نہ رہا۔ باہمی حق وانصاف کے تصورات میں ترقیاں کی گئیں اور انھیں تمدنی اور معاشری زندگی میں روبہ عمل لایا گیا۔ ایجاد و تخلیق کی صدیوں میں علما، فقہا، فنکار اور صوفیا اپنی تلاش وتحقیق اور زندگی کے تجربات میں آزاد تھے۔

لیکن اس بے پناہ قوت وعمل کی وسعت اور تہذیبی ترقی کے دور میں بھی چند واقعی اور امکانی رجعت پسند قوتیں غیر موجود نہ تھیں۔ سیاسی عمومیت اور جمہوریت کی اساس پر دور افتادہ علاقے مطیع ومنقاد نہیں رکھے جا سکتے تھے بادشاہت نے خلافت کی جگہ لے لی۔ اور ایک غیر منصوص قسم کی ملائیت نے علوم دین کی اجارہ داری حاصل کر لی۔ زندگی کے سانچے بے حس اور فرسودہ ہونا شروع ہوئے۔ انضباط واستحکام نے سکون وجمود کی صورت اختیار کر لی مطلق العنان بادشاہوں کے خلاف عوام خود کو بے بس ومجبور محسوس کرنے لگے۔ بے مہر تقدیر، آزاد اور تخلیقی ارادہ پر غالب آگئی۔ قیاس آرائیوں نے مردہ و بے جان ہو کر شرع وقانون کی صورت اختیار کر لی اور عوام سے کہا گیا کہ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کے انضباط میں جزوی تفصیلات کے لئے ان سے استفادہ کریں۔ اس کے بعد وحشی تاتاریوں کا سیلاب آیا۔ جو سیاسی، عمرانی اور ثقافتی قصر و ایوان کو، جو باوجود بوسیدگی کے ابتک قائم تھے، اپنی رو میں بہا لے گیا ان وحشی لوگوں کی اولاد نے جب مفتوحہ علاقوں میں بود وباش اختیار کی اور انھوں نے خود کو علم سے سنوارنا چاہا تو ان کے معلم مفتوح مسلمان ہوئے۔ جنہوں نے فوجی حیثیت سے شکست کھائی تھی۔ تہذیبی اعتبار سے نہیں۔ اسلام پر افترا پردازی کرنے والے مکروہ حد تک بار بار اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر ہوئی۔ مگر تاریخ شروع سے آخر تک انہیں جھٹلاتی رہی۔ جب پیغمبر اسلام نے دین اسلام کی تبلیغ فرمائی اس وقت جن لوگوں نے تلوار چلائی وہ آپ اور آپ کے متبعین نہیں تھے، بلکہ یہ مخالفین کی جماعت تھی۔ یہ سوال حل طلب ہے کہ اگر اسلام بزور شمشیر پھیلا تو ان شمشیر بازوں کا مذہب کس نے تبدیل کیا جو اس وقت تیغ آزمائی کر رہے تھے۔ مشرق

وسطیٰ کی سلطنتوں کے عین قلب میں عیسائی اکثریت کے علاقے اب تک موجود ہیں اور مصر میں عیسائی اقلیت مسلمانوں کے ساتھ لگاتار چودہ سو سال کے روابط و اثرات کے بعد بھی ہنوز قائم ہے۔ عربوں نے ہسپانیہ پر چھ صدیوں سے زیادہ سیاسی اور تہذیبی حیثیت سے حکمرانی کی، لیکن انھوں نے کبھی بزور شمشیر اپنی اکثریت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا انجام یہ ہوا کہ جب انھوں نے اپنا سیاسی اقتدار کھو دیا تو ان کے سامنے تبدیل مذہب یا جلاوطنی کی دو ہی صورتیں پیش کی گئیں۔ ترکوں نے مشرقی رومن امپائر کا بہترین علاقہ فتح کیا۔ لیکن انھوں نے اپنی عیسائی رعایا کے تبدیل مذہب کی ایسے زمانہ میں بھی کوئی کوشش نہیں جب محض قوت کے ذریعے ہر کام کی تکمیل کی جاسکتی تھی۔ اسی قسم کے رواداروں نے باوجود ہزار سالہ تسلط کے ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک اور تین کی نسبت کے ساتھ اقلیت میں رکھا۔ سیاسی اقتدار کے نظریہ کو سامنے رکھ کر بعض مسلمان اس امر پر تاسف کرتے ہیں کہ ہم نے مشرقی و مغربی یورپ اور ہندوستان کے سارے ذیلی براعظم کو اسلامی دنیا میں شامل کرنے کے بہترین موقعے کھو دیئے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ اسلام نے اس طرح سیاسی طاقت کھو دی، مگر اس نے اپنے نصب العین کو محفوظ رکھا جس کی بنا فی الاصل آزادیٔ ضمیر پر تھی۔ اور مسلمان نہایت دینداری کے ساتھ قرآن کے اس عدیم المثال حکم پر کاربند رہے کہ مذہب کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ روا نہ رکھا جائے۔ انسانی ضمیر کی آزادی کا تحفظ سیاسی تسلط سے کہیں زیادہ گرانقدر ہے جو دریا کے پانی کی طرح حادثات زمانہ کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

تاتاریوں اور ترکوں کے اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے اپنا سیاسی اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ترکان عثمانی، یورپ میں خود کو مستحکم کر کے ویانا کے دروازے کھٹکھٹانے لگے۔ لیکن مسلمانوں کی تہذیبی تخلیقی قوت تیرھویں صدی کے بعد ماند پڑ گئی۔ آخری غیر معمولی ذہانت کا شخص جو انھوں نے پیدا کیا وہ ابن خلدون تھا، جو عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے افکار اور زندگی کے سانچے رسمی اور غیر متبدل ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شاندار تہذیب اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اپنا کام ختم کر چکی ہے۔ اس کے بعد شارحین اور تبصرہ نگاروں کا دور شروع ہوا۔ یہ یقین کر لیا گیا کہ تمام صداقتوں کو قبل ازیں دریافت کر لیا گیا ہے اور زندگی کی رہنمائی کے لئے درگذشتہ میں صرف کسی موزوں ماخذ کی تلاش کافی ہے زندگی کے نمونے، جو نسلاً بعد نسل ہمدست ہوئے تھے، ان پر خدا کے مقرر کردہ نظامات کی مہر ثبت کر دی گئی۔ تمام آزادانہ فقہی سرگرمیاں، بجز غیر ضروری امور میں شارحین کی جدل و نزاع کے، سرد پڑ گئیں۔ قرآن اسلامی فکر اور ضابطہ و آئین کا آخری سرچشمہ تھا اور وہ معدودے چند قوانین پر مشتمل تھا۔ اس کا نہایت اہم حصہ وضع قوانین کے چند بنیادی اصول تھے، جو نہایت صاف اور بڑے ترقی پسند تھے۔ قرآن کے بعد قانون سازی کا دوسرا ماخذ آنحضرتؐ کے اقوال و افعال تھے۔ یہ ماخذ نہایت غیر یقینی اور بے ترتیب تھا۔ جو چھ یا زائد نسلوں کی زبانی

ترسیل و ارسال کے واسطوں سے پہنچا تھا۔ جس کو جہالت، مستقل ذاتی مفادات، اور فرقہ واری نزاعات نے مسخ کر دیا تھا اور جو قطعی اور قابل اعتماد معیار عمل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا صحیح و سقیم، مستند و موضوع، کی چھان بین میں بڑی کاوشیں کی گئیں۔ بعض بڑے فقہا نے محدثین کی متابعت کی اور انفرادی و اجتماعی راہ عمل کے ضوابط ترتیب دیئے۔ لیکن چونکہ کوئی مستند معیار نہیں تھا، اس لئے جزئیات اور اہم مسائل میں بھی باہم اختلاف رونما ہوا۔ شیعوں نے ایک جداگانہ مجموعۂ احادیث پر یقین کر کے خود اپنا ایک جداگانہ اصول قانون مستنبط کیا، جس کو اہل سنت والجماعت کی اکثریت الحاد و زندقہ سمجھتی ہے۔ لیکن اہل سنت کی راسخ الاعتقادی بھی کوئی قابل یقین اور با اصول شکل میں نہیں تھی۔ مقلدین ائمہ اربعہ فقہی گروہ بندیوں میں بٹ گئے اور ایک چھوٹی سی اقلیت غیر مقلد اہل حدیث کی رہ گئی، جو ان میں سے کسی ایک امام کی تقلید نہیں کرتے اور خود کو براہ راست کتاب و سنت سے استنباط مسائل میں آزاد سمجھتے ہیں۔ فقہا جن کے فتوے وحی الٰہی کی طرح واجب التنظیم تسلیم نہیں کئے جاتے، وہ خود اسلام کے وسیع حدود کے اندر مسائل کے سمجھنے میں آزاد تھے۔ لیکن ان کے متبعین نے ہر معاملہ میں اپنے آپ کو جکڑ بند کر لیا۔ اصول ایمان کی طرح ان پارینہ فیصلوں کو قبول کر کے کسی قسم کا ردوبدل روا نہیں رکھا، اور تغیر پذیر حالات کے ساتھ تمام جدید مطابقتوں کا دروازہ یک لخت بند کر دیا گیا۔ یہ اجتہاد کے تصور سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ اجتہاد کے معنی غور و فکر کے ذریعہ نتائج اخذ کرنے اور جدید آئین و دستور ترتیب دینے کے ہیں۔

اس تمام سند پرستی کا مآل سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی جمود کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسلام کے انقلابی کارناموں میں سے ایک مذہبی پیشوائیت کو برخاست کرنا تھا۔ اسلام نے نہ کسی ملا یا نہ جماعت کی حمایت کی اور نہ کوئی پیشہ ورانہ ملائیت قائم کی، لیکن ملائیت کی خرابیاں امت مسلمہ میں خفیہ طریق پر داخل ہو گئیں۔ اگرچہ کہ ان میں نہ کوئی مامور من اللہ پیشوا تھے اور نہ کلیسائی درجہ وار ترتیب تھی، جس کی صدارت پر کوئی خطا سے مبرا پوپ براجمان ہو۔ امت مسلمہ ان تمام مفسدات کا شکار ہوئی جن سے یورپ قرون مظلمہ اور ازمنۂ متوسط میں دوچار رہا تھا۔ تیرھویں صدی میں مسلمانوں پر جمود و بے حسی طاری تھی اور اس وقت یورپ ایک نئی زندگی کی کروٹ لے رہا تھا۔ مغرب نے مسلمانوں کی میراث سے استفادہ کیا، ان کے نمونوں پر یونیورسٹیاں قائم کیں اور عربی تصنیفات کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس طرح پر جو چیز پہلے انہیں ملی، وہ مسلم پیرایہ میں یونانی علوم کے اظہارات تھے۔ سینٹ ٹامس اکوینس جو کتھولک چرچ کا فرشتہ خصال عالم تھا، اپنے خیالات میں مسلمانوں کے دینیاتی اور فلسفیانہ افکار سے متاثر ہونے کی نمایاں علامتیں ظاہر کرتا ہے جس کسی نے اس کے پیشرو غزالی کا مطالعہ کیا ہے وہ اگر ان دو عالی دماغوں کا تقابل کرے، تو وہ غزالی کے براہ راست اثرات کا اعتراف کرنے سے گریز نہیں کر سکتا۔ صدہا سال تک ابن رشد کے متبعین اور مخالفین ایک لامتناہی جدل و نزاع کتھولک چرچ میں برپا کرتے رہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یورپ کی نشاۃ جدیدہ یونانی علوم کے احیاء سے ہوئی، مگر

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کے تہذیبی اثرات نے اس کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ عربی علوم مغرب کے حکیمانی فکر و نظر کا نقطۂ آغاز تھے۔ عین سترھویں صدی تک مغربی علم طب، اصول و عمل میں ابن سینا کی تصنیفات پر مبنی ہے۔

نشاۃ جدید کے بعد اصلاح و تجدید کا دور آیا۔ چرچ کے خلاف بغاوت، فرد کے ضمیر و ایمان سے براہ راست تخاطب اور بائبل کے آزادانہ مطالعہ کے ذریعہ خدا اور مسیح کی بے قید تلاش و جستجو، اسلامی افکار ہی کی آواز بازگشت تھی۔ لوتھر کے بعض معاندین نے جب اس کو مسلمانوں کے اصول و عقائد کی تقلید سے متہم کیا تو یہ کسی خبث باطنی کے تحت نہیں کہا جا رہا تھا۔

مغرب خواب غفلت سے بیدار ہو کر جادۂ ترقی پر گامزن ہوا، کیونکہ جس زندگی کو نظام جاگیرداری اور کلیسائیت نے ایک عرصہ سے حلقہ بگوش کر رکھا تھا وہ اب بطور خود ان طوق و سلاسل کو نکال پھینک رہی تھی۔ تجارت پیشہ متوسط شہری طبقہ کے برسر عروج آنے سے نظام جاگیرداری کی بنیادیں ہل گئیں۔ عمرانی فرائض کی بجا آوری میں ایک نئی سرگرمی پیدا ہوئی۔ یہ رجحان سولھویں صدی کے بعد سے مغربی اور وسطی یورپ میں غلبہ پانے لگا۔ دست کاری، زراعت اور ہر قسم کے تجارتی لین دین میں انفرادی کارگذاری کو آزادی دلانے کا میلان موجود تھا۔ عوام اپنے روایتی حکمرانوں، بادشاہوں، پیشواؤں، اور امیروں کی حماقتوں سے نجات پانے کے لئے کوشاں تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ معاشرہ فرداً فرداً اپنے اراکین کی پرامن مسابقت کے طریق پر چل رہا ہے، اور مملکت مثل ثالث بالخیر کے قائم ہے۔ عین ایسے وقت پر حسب معمول تعلقات میں انقطاع رونما ہوا۔ اولاً جہد و سعی کے ذریعہ اور تجارت پیشہ متوسط طبقہ کے مفاد کی خاطر، انگلستان اور فرانس میں خاص حقوق حاصل کئے گئے پھر یورپ میں جہاں کہیں بھی متوسط طبقہ اجتماعی زندگی کا خاص عنصر تھا۔ امریکی، فرانسیسی اور صنعتی انقلاب وہ تمثیلی واقعات تھے، جو اس نظام کو قبول کرنے سے رونما ہوئے، اور رجحانات نپولین کے بعد یورپ کی تعمیر نو ان ہی اصولوں کی رہنمائی میں ہوئی۔ اس معاشرت پسند انفرادیت کے غلبہ و تسلط سے زندگی زیادہ صحت بخش، پاکیزہ، اور معین ہو گئی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مشینی صنعتی نظام کے بسرعت تمام ترقی کرنے کے ساتھ مغرب میں جدید میلانات کا نشو و ارتقاء ہوا۔ بے قید سوداگرانہ انفرادیت، جو اصول عدم مداخلت یا نظریۂ بقائے اصلح پر مبنی تھی، اپنے آغاز ترقی ہی سے ایسی قوتوں کو وجود بخش رہی تھی، جو خود اس کی حریف تھیں۔ نری سیاسی عمومیت، جو اس تحریک سے حاصل ہوئی وہ معاشی عمومیت (یعنی ثقافتی اور معاشی مواقع کا تمام طبقوں کو یکساں اور بلا تفریق و امتیاز حاصل ہونا) کے بغیر ناکافی تصور کی گئی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ فی کس ایک رائے دینے کا حق ایک عام آدمی کی حالت کو اس حد تک سدھارنے کے قابل نہ ہو سکا، جس حد تک تیزی کے ساتھ بڑھنے والی مادی اشیا کی پیدائش اس کو مستحق گردانتی تھی۔

مفکرین اور مصلحین کے قلب و دماغ گوناگوں اجتماعی نظریات کی جانب مبذول ہوئے۔ تمام سنجیدہ اور متین اہل فکر نے یہ محسوس کیا کہ بے قید معاشی انفرادیت پر یہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کثیر تعداد کی زیادہ سے زیادہ خوشحالی پر منتج ہوگی۔ صنعتی نظام کے عفریت نے فرد کو بالکل دبوچ لیا، اور یہ نظام جاگیرداری، شاہیت اور کلیسائیت کے قید و بند سے رہائی پاکر دوبارہ پابند، اور فردیت و انسانیت سے محروم کر دیا گیا۔ نسل انسانی کو از سر نو اپنے ان نئے آقاؤں کی غارتگری سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ ہر جگہ عوام نے اپنا اعتماد مجرد سیاسی حمومیت پر سے کھو دیا۔ اطالیہ اور جرمنی میں پرستش و بندگی کا رخ فرد سے مملکت کی جانب پھر گیا۔ ہمہ گیر آمریت نے ایک عامی سے، زیادہ سے زیادہ مادی و جسمانی تحفظ کا وعدہ اس شرط کے ساتھ کیا کہ وہ انفرادی آزادی کے تمام دعووں سے دست بردار ہو جائے۔ فاشیت اور نازیت کا تو زبردست فوجی ہزیمتوں سے قلع قمع ہو گیا، مگر اشتمالیت نے روس اور اس کی طفیلی مملکتوں میں پہلے سے زیادہ اپنے آپ کو مستحکم کر لیا۔ نئے علاقوں کا الحاق ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی انتہا چین کے انقلاب پر ہوئی جو غالباً عصر حاضر کا نہایت مہتم بالشان واقعہ ہے۔

جبکہ یہ تمام موثر تحریکیں نشو و نما پا رہی تھیں، اور اپنے بحث و مناظرہ سے سلبی و ایجابی نتائج کی پردہ کشائی کر رہی تھیں، اور مختلف سیاسی، معاشی اور عمرانی نظامات کے ادھیڑ بن میں لگاتار مصروف عمل تھیں، تو دنیائے اسلام اس وقت غفلت کی نیند سو رہی تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ زیادہ عرصہ تک یہ لوگ الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ مغرب کی صنعتی ترقی نے ایک ناقابل مقاومت فوجی قوت کی تخلیق کی۔ صنعت کار قومیں اشیائے خام کے لئے منڈیوں اور اپنی مصنوعات کے لئے کلاسی کی خواہاں تھیں۔ محض عسکری جوش اور انفرادی دلیری جدید اسلحہ اور معاشی نظامات کے مقابلہ میں بے بس تھے، جن کی پشت پر ایسی مملکتوں کی طاقت تھی جنہوں نے خود کو معاشی انتفاعی قوتوں کے ساتھ ہم رنگ کر لیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ، جو تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی، جدید اسلحہ اور ان صنعتوں میں پس ماندہ تھی جن سے اصل ذرائع جنگ مہیا ہوتے ہیں اور کوئی قوم موجودہ جنگ کامیابی کے ساتھ لڑ نہیں سکتی تھی۔ ترک جو یورپ کے مشرقی علاقوں پر حکمران تھے، ان نئی طاقتوں کا اندازہ نہ کر سکے۔ زوال یافتہ شاہیت، جس کی پشت پر ایسا ہی تنزل یافتہ دینی اقتدار تھا، اپنی ایک ایسی زندگی کا سانچہ بدلنے کے لئے کوئی قوی سبب نہ پا سکی جس نے صدہا سال تک بخوبی کام انجام دیا تھا، مگر اب جس کو سختی کے ساتھ جانچنے کی ضرورت تھی۔ زندگی کی بنیادوں کو بلا ہاتھ لگائے ہوئے صرف بالائی عمارت کی بے اعتنائی کے ساتھ لیپ تھوپ کر دی گئی۔ اقوام یورپ نظریاتی اور معاشی اعتبار سے بہتر ساز و سامان سے لیس ہو کر عالم اسلامی پر قبضہ و تصرف کا عزم کر چکی تھیں، جس کی نسبت وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی کارگر مقاومت نہ کر سکیگا۔ بحر اقیانوس سے بحر الکاہل تک اور مراکش سے انڈونیشیا تک، مسلم اقوام اور مملکتیں یا براہ راست مسخر و ملحق کی گئیں یا بالواسطہ

مغربی اقتدار کے زیر تصرف لائی گئیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں، دنیائے اسلام بالکلیہ شکست خوردہ، بے دست و پا، اور حلقہ بگوش ہو چکی تھی۔ یورپ کی طاقتور صنعتی مملکتوں کے حوصلے بے پناہ تھے اس لئے ایک باہمی تباہی و ہلاکت کا واقع ہونا یقینی تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی عالم آشوب جنگ نے ربع مسکوں کو اس کی بنیادوں سے ہلا دیا۔ اتحادی سلطنتوں نے فوجی ضرورت سے مجبور ہو کر، بطور مقصد جنگ، تمام چھوٹی اور بڑی قوموں کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے اس امر کا اقرار کیا کہ یہ جنگ آزمائی ہر قسم کی حرب و پیکار کو ختم کرنے اور دنیا کے لئے عمومیت کو محفوظ کر دینے کی غرض سے ہے۔ لیکن جب انھوں نے کامرانی حاصل کی اور اپنے حریفوں کو کچل دیا، تو اپنے اعلیٰ مقاصد فراموش کر گئے۔ ہزیمت خوردہ سلطنتوں کے حصے بخرے نئے سامراجی منصوبوں کے مطابق کر دیئے گئے۔ عرب اقوام نے، جنہیں اپنے سابقہ حکمرانوں کے خلاف پس پشت خنجر زنی پر آمادہ کیا گیا تھا، اپنے آپ کو مکر و فریب کا شکار پایا۔ ان کے لئے یہ تغیر صرف آقاؤں کی ایک تبدیلی تھی۔ ایک جدید منافقانہ سیاسی اصطلاح تراشی گئی اور الحاق و انضمام کو انتداب کا نام دیا گیا۔ دنیائے اسلام کے عین قلب میں ایک یہودی مملکت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس عالمگیر جنگ نے کمزور اقوام کو حریت و آزادی نہیں بخشی تھی، بلکہ انہیں بیدار اور خود آگاہ کر دیا تھا۔ شخصی آزادی اور خود ارادیت کی تحریکات کو ہر جگہ تقویت حاصل ہوئی، جس نے تمام قدیمی سانچوں کو تباہ و برباد کرنے کے کام کی تکمیل کر دی۔ ترکوں نے مغربی قومی اساس پر اپنے ملک کا نظم و نسق قائم کیا اور بحیثیت ایک چھوٹی طاقت کے پہلے سے زیادہ قوی و مستحکم ہو گئے۔ جبکہ وہ اپنی توانائیاں ایک وسیع مملکت کو سنبھالنے کے لئے بیرونی حملوں اور اندرونی تخریبی کارروائیوں کی مدافعت میں صرف کرتے تھے۔ عرب ہنوز آزادی کامل کے لئے مصروف جہد و عمل ہیں، لیکن بجائے یکسوئی کے مختلف سمتوں پر مسلسل جادہ پیما ہیں۔ پاکستان اور انڈونیشیا جیسے وسیع اور کثیر آبادی رکھنے والے ممالک کا ظہور ہوا جو زبردست قدرتی وسائل اور انسانی طاقت کے حامل ہیں۔ شمالی افریقہ میں لیبیا کی مملکت معرض وجود میں آئی، اور طرابلس، الجزائر، اور مراکش کے علاقے فرانس کی غارتگر از شہنشاہیت سے گلوخلاصی کے لئے جد و جہد کرنے لگے۔ افریقہ کے نیم مہذب اور پس ماندہ علاقے بھی بیدار ہو رہے ہیں، اور غارتگر سفید فام حکمرانوں کے لئے باعث تشویش بن رہے ہیں۔

بیرونی اقتدار سے آزادی، تمام دیگر آزادیوں کے حصول کی اولین اور لازمی شرط ہے۔ اس وقت بعض مسلمان قومیں سیاسی حیثیت سے کاملاً آزاد ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس سمت آگے بڑھ رہی ہیں اور وہ کیا نصب العین ہے جو انھوں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے؟ ترکوں نے ایک جمہوریہ تشکیل دیا، جس کی بنا انیسویں صدی کی مغربی جمہویت پسندی کے تصورات ہیں۔ اس امر کے تجربہ کے بعد کہ محض دینی رشتہ خاطر خواہ قوی محرک نہیں ہے، انھوں نے اپنے آپ کو مغربی انداز کی نسلی قومیت کا پابند کر لیا اور ایک ظلمت پسند مذہبی اقتدار کے تلخ تجربہ کے بعد

سیاسیات اور معاشیات کو ایک دوسرے سے جدا کر کے ایک لادینی حکومت، مذہب کو بطور شخصی ایمان وضمیر کے معاملے میں برقرار رکھتے ہوئے مغربی نہج پر قائم کی۔ مذہب کے خلاف ایک عام انحراف جیسا کہ روس میں پیدا ہوا، یہاں نہیں تھا، بلکہ مولویوں کی گرفت سے چھٹکارا حاصل کیا گیا جو زندگی کے حقائق سے ناآشنا تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ اخلاقی و روحانی امور سے تعلق رکھتا ہے، اور نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قوانین اور رسوم وعادات میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ اسلام میں کسی مستقل مذہبی جماعت کا وجود نہیں، بلکہ مسخ شدہ دینیات اور فقہیات موجود تھی۔ ترکی کی ذہین ودلیر سیاست دان خاتون اور ایک نامور مصنفہ خالدہ ادیب خانم نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ ہم انقلابی ترک اسلام کے پروٹسٹنٹ ہیں۔ عرب ممالک میں طرز زندگی قدیم بدوی تعلقات اور معاشرہ سے لے کر جزوی طور پر جدید وضع قطع تک مصر وشام جیسے علاقوں میں پائی جاتی ہے مغرب کے ساتھ تعلقات وروابط کے باعث عربوں کی قومیت پرستی اس امر کے لئے کوشاں ہے کہ عظیم تر اسلامی ملت میں رہ کر اتحاد عرب کو تقویت پہنچائی جائے۔ عربی، اسلامی تہذیب پر فخر واعتماد کے ساتھ مغربی طرز روش کو شعوری غیر شعوری طور پر بکثرت اختیار کیا جارہا ہے۔ مصر وشام کے بلند پایہ مفکرین، محض عقلی اساس پر اسلامی اصولوں کی جدید توضیح وتشریح کر رہے ہیں۔ انڈونیشیا میں ایک زبردست مذہبی جماعت اپنی نو حاصل کردہ آزادی کی عمارت اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر کھڑی کر رہی ہے۔

عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاسی اضطراب وہیجان کے ساتھ ساتھ تہذیبی کشمکش بھی برسرکار رہے۔ ہر جگہ کا ملا احساس وعمل عروج وترقی، احیاء وتجدید کا تقاضہ موجود ہے۔ احیائے مذہب کی تحریکات مختلف نوعیت کی ہیں۔ تاہم ایک چیز ان میں مشترک ہے۔ وہ یہ اعتقاد ہے کہ روحانی فیضان ومنال کے لئے انہیں اسلام کی اولین تحریک کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔ اسلام کی اصلی خوبی کو، مابعد کے تمام حشو وزوائد اور گمراہیوں سے بے اعتنا ہو کر جنہوں نے اس کے اصل چہرہ پر غیر اسلامی تصورات ورسومات کے پردے ڈالدیئے ہیں، حاصل کرنا چاہیئے۔ ہم یہاں تجدد پرستی کے مختلف مکاتب خیال پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ایک مکتب خیال اس امر کا مدعی ہے کہ اصل اسلام قرآن پر مشتمل ہے۔ اس لئے صرف کتاب مقدس ہی سے، بحیثیت مستند ماخذ کے، رجوع کرنا ہے لیکن قرآن زیادہ تر عام اصول کی تعلیم چند گنے چنے قوانین کی صورت میں دیتا ہے۔ چنانچہ اس مکتب خیال میں بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اس کتاب مقدس میں قوانین کا جس حیثیت سے اظہار ہوا ہے وہ ابدی اور اٹل ہیں، لیکن دوسرے اس پر زور دیتے ہیں کہ قرآن میں جن معاشری حالات سے قوانین بحث کرتے ہیں وہ اس وقت کی صورت موجودہ کے لحاظ سے تھے اس لئے یہ قوانین نہیں، بلکہ ان کے پس پردہ جو اساسی اصول کارفرما ہیں وہی مذہب کے ہمیشہ قائم رہنے والے اجزاء ہیں۔ حامیان تجدد کا دوسرا طبقہ یہ یقین رکھتا ہے کہ قرآن تفصیلی ہدایت د

روشنی کے لئے بھی کافی ہے، وہ اس طرح پر کہ اس کا مکمل تعلیمات و سنت رسولؐ سے ہوتا ہے۔ ان کے مخالفین یہ خیال کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے طریقوں اور فیصلوں کا پتہ چلانا دشوار ہے، کیونکہ احادیث کا ذخیرہ بالکل واضح اور یکساں اصول پر مبنی نہیں ہے، اور صریح اضافہ و الحاق کے علامات ظاہر کرتا ہے۔ اگر یہ تحقیق بھی ہو جائے کہ آنحضرت صلعم نے کسی خاص موقع پر کسی خاص طرح عمل فرمایا تھا، تو اس کو صرف موقتی اہمیت دی جائیگی اور کلیتاً تبدیل شدہ حالات میں ایک جدید فیصلہ ان اصحاب علم و اخلاق کی طرف سے دیا جائے گا جو اسلام کے اصل منشا و مقتضا کا درک و فہم رکھتے ہیں۔ بعض دیگر حامیان تجدید ان تمام فقہی مجموعوں کو، جنہیں بڑے فقہا نے ابتدائی صدیوں میں ترتیب دیا تھا، اسلام کے غیر تغیر پذیر اجزا کی طرح شمار کرتے ہیں۔ لیکن یہ فقہی مجموعے منو کے دھرم شاستر کی طرح صرف دیوانی اور فوجداری قوانین میں محدود نہیں ہیں۔ ایمان و اخلاق کے اصول شخصی زندگی کے تفصیلی ضوابط، اور آداب معاشرت ان میں گھل مل گئے ہیں۔ یہ لوگ بجز ان معاملات کے، جن کی تفصیل نہیں کی گئی، قانون سازی کی آزادی یا انفرادی زندگی کی آزادانہ تنظیم کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ مشکل سے کوئی چیز نہایت اہم یا عارضی نوعیت کی ایسی ہوگی جس کے لئے کوئی سند نہ تلاش کرتے ہوں۔ اس لئے عملی طور پر جملہ اجتماعی، معاشی، سیاسی اور شخصی زندگی کے نمونے رسمی اور غیر متبدل بن گئے ہیں۔ یہ متجددین گویا اسلام کے تلمودی ہیں۔

اس موقع پر ہمیں پاکستان کی مثال لینی چاہیئے جو ایک اسلامی مملکت بنانے کے لئے ہندوستان کے ذیلی براعظم سے جدا کیا گیا تھا، اور جہاں مسلمان اسلامی طریق زندگی اختیار کرنے میں آزاد ہیں۔ اس مملکت کی تخلیق سے تقریباً ایک صدی پیشتر سے مسلمان اصول مذہب اور شرائط ایمان پر بحث کرتے رہے۔ چونکہ انہیں کوئی سیاسی اقتدار حاصل نہیں تھا اس لئے یہ مذہبی مباحثات نظری اور فرقہ پرستانہ سطح پر جاری رہے۔ علاوہ اس کے یہ کوئی قومی ذمہ داریاں بھی نہیں رکھتے تھے اس لئے یہ مناظرات، غیر ذمہ دارانہ دنیاتی اور تصوری نوعیت کے حامل تھے۔ ایک ایسا سیاسی نظام جس میں وہ زندگی گذارنے پر مجبور تھے، خود ان کا پیدا کردہ نہ تھا اس میں کسی قسم کا ردوبدل ان کے بس سے باہر تھا۔ ایک مخصوص معاشی طرز زندگی بھی تاریخ کی منطق نے ان پر عائد کر دیا تھا۔ ایک غیر ملکی حکومت کے ہاتھوں میں ان کے بین الاقوامی تعلقات تھے، اور ان کی تعلیم بھی آزاد نہ تھی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے ساتھ ہی وہ دفعتاً نہایت اہم مسائل اور ٹھوس حقائق سے دوچار ہوئے۔ قرارداد مقاصد میں اسلامی نظام حیات پر انھوں نے اپنے ایمان و یقین کی توثیق کی اور اس امر کا اقرار کیا کہ وہ اپنے دستور، قوانین، اور اداروں کی قرآن و سنت پر تشکیل کرینگے۔ مگر یہ الفاظ نہایت غیر معین تھے، جن کی تشریح و توضیح ان کے بالکل برخلاف بھی کی جا سکتی تھی۔ دستور میں اس کو معین شکل دینے کے لئے بڑا شور و ہنگامہ رہا۔ تقریباً چار سال تک سوچ بچار اور اظہار و اشتہار کے

بعد اساسی اصول کا اعلان کیا گیا، جن کے لئے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اس میں یہ کوشش کی گئی کہ متعدد اور مختلف دعویداروں کو راضی کیا جائے، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی مطمئن نہ ہو سکا۔ مختلف اسلامی فرقوں کو تسلیم کیا گیا تھا، جنہوں نے اس امر کے اظہار میں بڑی پھرتی دکھلائی کہ وہ بجز اپنی ذات کے کسی اور کی تعبیر و تفسیر کے پابند نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام معاملہ کا ایک مضحکہ خیز ناکامی پر خاتمہ ہوگا۔ کیونکہ دستور کی بنا اگر اسلام پر ہو اور اسلام کی توضیح بیسیوں فرقوں کی طرف سے ایک دوسرے سے متضاد ہو، تو مشترک و متحد اساس کہاں ہوگی، جس کے بغیر کوئی اگلا قدم اٹھایا نہیں جا سکتا۔ زبانی دعوؤں اور نعروں سے گذر کر حقائق سے دوچار ہوتے ہی ایک تعطل سا رونما ہو گیا۔ حکومت کو زمیندار اور لگان دار کے تعلق اور مختلف نوعیت کے حق ملکیت زمین کے جواز و عدم جواز کی بابت تصفیہ کرنا ہے۔ حکومت کو سرمایہ اور محنت کی بابت بھی فیصلہ صادر کرنا ہے۔ حکومت کو اپنے مالی نظام اور بنک کاری کی بابت بھی طے کرنا ہے جس کو راسخ الاعتقاد کافرانہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اسلام میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ تصفیہ طلب ہے کہ آیا بنک کا سود اور کاروبار کا سود، دونوں مثل ربا کے ایک ہی ہیں، جس کی اسلام نے ممانعت کی ہے۔ موجودہ نظام زندگی میں عورت کے مرتبہ کا تعین کرنا ہے۔ ایک مسلمان مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق کی واضح طور پر تعریف کرنا ضروری ہے اور ایک عمومی مملکت میں ان تمام امتناعات کو رفع کرنا لازم ہے جن کی بنا کسی جنس و عقیدہ پر ہو۔

اگر مسلمان اپنی ہم عہد اور آئندہ نسل انسانی کی زندگی میں کوئی باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ایک ناقابل گریز حقیقت ہے کہ ان کی زندگی اپنی تمام صورتوں میں کاملاً اصلاح و تجدید کی محتاج ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ایک فرسودہ مذہب ہے اور بطور ایک مانع ترقی مذہب کے اس کو ترک کر دینا چاہیئے، یا ہمیں انسانیت کی مادی اور ذہنی ترقی کی روشنی میں اس کی جدید تفسیر کرنی چاہیئے۔ کیا مسلمانوں کو ہر اعتبار سے مغرب کی ترقی پسند قوموں کی محض تقلید کرنی چاہیئے، یا انہیں تخلیقی امتزاج کے ذریعہ کچھ نہ کچھ خدمت سرانجام دینی چاہیئے

اسلام کی اصلی قوت ان تصورات کے ان دلیرانہ امتزاجات کی رہین منت ہے، جن کو مختلف قوموں کے غیر معمولی ذہن و دماغ اس سے قبل الگ الگ نشوونما دیتے رہے۔ اس نے دنیوی اور اخروی زندگی اور دیگر خالق کائنات کو باہم مربوط کیا اور اس زندگی کی فلاح و بہبود کو ابدی اقدار کی وصولیابی کا زینہ قرار دیا۔ رہبانیت اور آخرت پرستی کی شکل میں سلبی روحانیت کو مردود ٹھہرایا، اور یہ تعلیم دی کہ اس دنیا کی زندگی کے جملہ معاملات کو راست بازانہ اور صحت بخش طرز و روش اختیار کر کے روحانی و مذہبی بنایا جائے۔ زاہد شب زندہ دار کو نہیں، بلکہ محنت کرنے والے کو حبیب اللہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ ملائیت جو مستقل مذہبی

مفادات کی اجارہ دار اور نگران کار کی حیثیت رکھتی تھی، وہ برخاست کردی گئی۔ غلاموں کو آزادی دلانا۔ نیکوکاری اور اخلاقی خوبی کا زبردست عمل گردانا گیا۔ فطرت اور مافوق فطرت کے درمیان جو حد فاصل تھی وہ محو کردی گئی۔ دلدادگان خرق عادت سے کہا گیا کہ وہ خدا کی تلاش انفس کے مطالعہ کے ذریعہ کریں۔ اور مذہب کی تعریف فطرت الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کی گئی، جو روح انسانی میں پھونکی گئی ہے۔ اخلاقی اور روحانی زندگی کے لئے معاشی عدل کو ناگزیر شرط قرار دیا گیا۔ قانون وراثت کے ذریعہ نظام جاگیرداری کالعدم قرار دی گئی اور اس بات کی ممانعت کردی گئی کہ خلف اکبر غیر منقسم جائیداد کا وارث ہوگا۔ نسلی امتیازات کی نفی کی گئی اور انسان کو قبائلیت کی پستی سے نکال کر آفاقیت اور عالمگیر انسانیت کے درجے پر سربلند کیا گیا۔ بادشاہت کو عمومی جمہوریت کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی، جس میں قسمتوں کی رہنمائی کے لئے قوم کے بہترین فرد کا انتخاب بذریعہ اجتماع امت کیا جاتا تھا۔ مواقع کی یکساں فراہمی اور قانون کی نظر میں سب کی برابری، اجتماعی اور شہری زندگی کی اساس قرار دی گئی۔ تمام امتیازی حقوق پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا۔ عورت کو آزادانہ مالی حیثیت عطا کی گئی، وہ ذاتی ملکیت رکھ سکتی تھی اور میراث میں منصفانہ حق پاتی تھی۔ نکاح کو مقابل جنس کے دو آزاد اشخاص کے درمیان عقد معاشرت کی صورت دی گئی اور نکاح نامہ میں کوئی بھی جائز شرط داخل کی جاسکتی تھی۔ علم کی جستجو کی، بحیثیت ایک مذہبی عمل کے تاکید کی گئی۔ یہ علم نہ دنیات کا تھا اور نہ مذہبی رسومات کا، بلکہ یہ ایک غیر محدود زندگی کا عمل تھا جو انسان کو ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہی سبب ہے کہ یونانی عقلیت کو اسلامی تہذیب میں آسانی کے ساتھ سمو لیا گیا۔ آزادی ضمیر کا شاندار اصول جزو ایمان قرار دیا گیا۔

اصطلاحات کے جدید مفہوم کے لحاظ سے اصلی اسلام نہ کلیسائی ہے اور نہ لادینی۔ مغرب میں لادینیت، چرچ اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اسلام نے ان دونوں اداروں کو برخاست کردیا، اس لئے دنیوی زندگی کو انحطاط یافتہ مذہبی حکومت کی گرفت سے آزادی دلانے کی یہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔ خالق اور مخلوق کے درمیان کسی وسیلہ کی حاجت نہ تھی۔

ملت بیضا کی احیاء و تجدید، اور انسانوں کی از سر نو قیادت کے لئے اسلام کی حقیقی روح کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لئے خذ ما صفا کے اصول پر کاربند ہو کر ان اچھی چیزوں کو لیتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیئے جو غیروں کے ہاتھوں نشوونما پاتی ہیں۔ اسلام میں کوئی جغرافی اور نسلی قومیت نہیں ہے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۔ اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب ہے۔

کوئی چاہے تو اس میں یہ اضافہ کرسکتا ہے کہ اللہ ماضی، حال اور استقبال ہے، کیونکہ اللہ ہی زندگی کے دائمی اقتدار کا مقصود اعلیٰ ہے۔

(باقی آئندہ)